نامۂ بے نام

بالا کوٹ اور کیوائی کے درمیان دریائے کنہار کی گزرگاہ پر وہ ایک خوبصورت پہاڑی تھا۔ حدِ نگاہ تک سبزہ، اُبلتے ہوئے چشمے، پتھروں کے درمیان اٹھکیلیاں کرتے ندی نالے۔ دور پس منظر میں برف پوش چوٹیاں۔ نگاہ جس طرف بھی اُٹھتی تھی اسی طرف ایک حسین نظارہ منتظر ملتا تھا۔ قصبے کی آبادی قریباً پندرہ سو نفوس پر مشتمل تھی۔ یہ سب لوگ کھیتی باڑی کرتے تھے یا بھیڑ بکریاں اور مرغیاں وغیرہ پالتے تھے۔ حسین فضاؤں میں بسا ہوا یہ حسین لوگوں کا نظر نواز قصبہ تھا۔

پوسٹ مین اعجاز کی تبدیلی جب اس علاقے میں ہوئی تو وہ کچھ بہت زیادہ خوش نہیں تھا۔ لیکن آٹھ دس روز کے اندر ہی اس قصبے نے اور قصبے کے لوگوں نے اُسے بہلا لیا۔ وہ خود کو اس خوبصورت ماحول کا ایک حصہ محسوس کرنے لگا۔ پوسٹ آفس اس قصبے کے اندر ہی واقع تھا۔ اس آفس کے عقب میں اعجاز کو رہنے کے لئے ایک چھوٹا سا کوارٹر نما گھر ملا ہوا تھا۔ گھر کے پہلو سے ایک پُرشور آب جو بہتی تھی۔ گھر کو تو یہ شور تھا لیکن اس کی حیثیت چند ہی دنوں میں اعجاز کے دل و دماغ میں رچ بس گئی۔ اعجاز صبح سویرے ناشتے کے بعد پوسٹ آفس کا رُخ کرتا۔ کام بہت زیادہ تو نہیں تھا لیکن بکھرا ہوا تھا۔ اُسے قصبے کے علاوہ قرب و جوار کے تین دیہات اور تین چار چھوٹی چھوٹی بستیوں میں ڈاک تقسیم کرنا ہوتی تھی۔ بعض اوقات صرف ایک خط [illegible] کے لئے اُسے اونچے نیچے پہاڑی راستوں پر چار چار میل کا فاصلہ طے کرنا پڑ جاتا تھا۔ بہرحال یہ بات طے تھی کہ وہ کام سے جی چرانے والا نہیں تھا۔

کام سے فارغ ہو کر وہ سہ پہر کے وقت کوارٹر میں واپس آ جاتا۔ [illegible] کرتا پھر آبشار کی طرف نکل جاتا۔ واپسی پر کھانا تیار ہوتا۔ اُس کے کھانے پینے کا انتظام پڑوسیوں کی طرف تھا۔ اماں فاطمہ اور چاچا گلریز خاں اُس کے پڑوسی تھے۔ چند ہی روز

میں وہ اُسے بالکل اپنے اپنے سے لگنے لگے تھے۔

چاچا گلریز قصبے کے سربراہ ملک خداداد خاں کے کھیتوں میں مزارعے کے طور پر کام کرتا تھا اور اُس کی بیوی فاطمہ ملک خداداد کی حویلی میں خدمت انجام دیتی تھی۔ دونوں ہی بڑے قناعت پسند، ہمدرد اور محبت کرنے والے تھے۔ ان سے مل کر نجانے کیوں اعجاز کے دل سے اکیلے پن اور تنہائی کا احساس ختم ہونے لگا تھا۔

وہ اپریل کی ایک بڑی ہی سہانی سہ پہر تھی جب اعجاز نے اُس لڑکی کو پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ قریبی بستی "چندری" میں ڈاک تقسیم کر کے قصبے کی طرف واپس لوٹ رہا تھا۔ وہ لڑکی اُسے دور ہی سے نظر آ گئی تھی۔ شاید اس لئے کہ وہ سامنے نظر آنے والے خوبصورت منظر سے بالکل جدا تھی۔ ایک حسین گردوپیش کے درمیان وہ ایک اُداس ہیولے کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ وہ پتھر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کے پاؤں دریا کے بہتے پانی میں تھے۔ آنچل ہوا میں اُڑ رہا تھا اور مقامی طرز کا سیاہ لبادہ ہولے ہولے پھڑپھڑا رہا تھا۔ اعجاز کو دیکھ کر وہ بے ساختہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ کچھ دیر تک محویت سے اُس کی طرف تکتی رہی، پھر چند قدم تیزی سے چل کر اُس کے قریب آ گئی۔ درمیانی فاصلہ اب بہت کم تھا۔ اعجاز نے غور سے دیکھا، وہ خوبصورت تھی۔ خوبصورت چہرے تو اُس نے یہاں اور بھی بہت دیکھے تھے لیکن یہ خوبصورتی اس لحاظ سے جدا محسوس ہوئی کہ اس میں ایک خواب ناک سی کیفیت تھی جیسے وہ جیتی جاگتی لڑکی نہ ہو، افسانوں، کہانیوں میں پایا جانے والا کوئی تصوراتی کردار ہو، جو کسی خوبصورت کتاب میں سے نکل کر اچانک اُس کے سامنے آ گیا ہو۔ مگر جب وہ بولی تو اعجاز تصور سے حقیقت کی دنیا میں آ گیا۔

"بابو! میرے نام کا کوئی خط ہے؟" اُس نے آس بھرے لہجے میں پوچھا۔

"تو کیا نام ہے تمہارا؟" اعجاز نے پوچھا۔

اُس کے چہرے پر شفق کا رنگ لہرایا۔ "سنبل!"

اعجاز نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے خطوں پر ایک رسمی نگاہ ڈالی اور ذہن پر زور دے کر بولا۔ "نہیں۔ اس نام کا تو کوئی خط نہیں ہے۔"

"بابا کے نام کا .... مم .... میرا مطلب ہے ملک خداداد کے نام کا؟"

"نہیں۔ آج تو ان کے نام کا بھی کوئی خط نہیں۔ پرسوں ایک چٹھی آئی تھی، وہ میں نے دے

دن تھی۔''

''ادا... کا نام تو نہیں تھا؟''

''نہیں۔'' اعجاز نے پورے یقین سے کہا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ''ملک خداداد تمہارے والد ہیں؟'' سنبل نے اُداسی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اُداسی یقیناً اس بات کی نہیں تھی کہ ملک خداداد اُس کے والد تھے بلکہ اس بات کی تھی کہ ان کے نام کا کوئی خط اعجاز کے پاس موجود نہیں تھا۔ وہ وہیں گم صم سی پتھر پر کھڑی رہی اور اعجاز آگے بڑھ گیا۔

دو روز بعد اسی مقام پر سنبل سے اُس کی ملاقات ہوئی۔ وہ بھی ... وقت تھا۔ دور شمال کے برف پوش پہاڑوں سے سیاہی مائل بادل اُٹھ کر وادی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ وہیں پتھر پر بیٹھی تھی۔ جنوب کے رُخ پر بلند و بالا پہاڑوں کو تک رہی تھی۔ اعجاز کو دیکھ کر جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ اعجاز قریب آیا تو وہ حسب سابق بولی۔ ''بابو! میرے نام کا کوئی خط تو نہیں؟''

''تمہارا نام سنبل ہے نا؟'' اعجاز نے یوں ہی کہہ دیا۔

سنبل کے چہرے پر اُمید کی چمک برق بن کر لہرائی۔ ''ہاں!'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

''سنبل کے نام کا تو کوئی خط نہیں ہے۔'' اعجاز نے کہا۔ ''اور ملک صاحب کے نام کا بھی نہیں۔''

وہ کچھ دیر اداس کھڑی رہی، پھر بے دم سی ہو کر پتھر پر بیٹھ گئی۔ وہ ایک غم زدہ تصویر کی طرح نظر آ رہی تھی۔ اعجاز کچھ دیر حوصلہ جمع کرتا رہا پھر بولا۔ ''بہت پریشان نظر آتی ہو تم؟''

''نہیں تو۔'' وہ سر جھکا کر بولی۔

''کوئی ضروری خط آنا ہے تمہارا؟''

''ہاں۔'' اُس نے کہا۔

اعجاز مزید کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن لڑکی کا انداز حوصلہ افزائی کا نہیں تھا۔ وہ کان میں پنسل درست کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

اعجاز کی عمر اٹھائیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ ایبٹ آباد کا رہنے والا تھا۔ ایبٹ آباد

میں ہی اُس کی شادی ہوئی تھی۔ میاں بیوی نے چار پانچ ماہ تو بخوبی گزارے تھے پھر اُن میں اختلافات پیدا ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے اتنے وسیع ہو گئے کہ نوبت طلاق تک جا پہنچی۔ چھوٹے چھوٹے گھریلو جھگڑے تھے لیکن اصل بات یہ تھی کہ ان دونوں کی طبیعت میل نہیں کھاتی تھی۔ بیوی کوری اَن پڑھ تھی جبکہ اعجاز نے میٹرک کیا تھا۔ (یہ اُن دنوں بہت اہم بات تھی) وہ زندگی کی خوبصورتی پر یقین رکھتا تھا۔ خوبصورت گفتگو، خوبصورت مناظر، دلکش ماحول، نفاست اور شائستگی، یہ سب کچھ اُس کے دل کو بھاتا تھا۔ جبکہ بیوی بالکل برعکس تھی۔ وہ قبول صورت تھی لیکن اس کے سوا کچھ بھی نہیں تھی۔ اُس کی دلچسپیاں اچھی خوراک اور زرق برق کپڑوں تک محدود تھیں۔ پھر وہ پرلے درجے کی لالچی بھی تھی۔ یہ ان کے مزاج کا بُعد تھا کہ اُن میں جو بھی چھوٹا موٹا اختلاف پیدا ہوا وہ پھیل کر تنازع بن گیا۔

اعجاز کی والدہ اکثر بیمار رہتی تھیں۔ اعجاز کی بیوی اُن کی طرف رتی بھر توجہ نہیں دیتی تھی۔ اعجاز اور تو سب کچھ برداشت کرسکتا تھا لیکن یہ بات گوارہ نہیں کرسکتا تھا کہ جب وہ ڈیوٹی پر ہو، اُس کی والدہ بے بسی کے عالم میں پڑوسیوں کو پکارتی رہیں۔ اُس نے کئی بار بیوی کو اس حوالے سے سمجھایا لیکن ان باتوں کا اُلٹا اثر ہوا۔ یہ تنازع اتنا بڑھا کہ آخر ان دونوں میں طلاق ہوگئی۔ اس واقعے کے دو تین ہفتے بعد ہی اعجاز کی والدہ بھی انتقال کر گئیں۔ یوں اعجاز ایک دم اکیلے پن اور تنہائی کے دشت میں کھو گیا۔ والدہ کی وفات نے اس کے دل پر گہرا اثر کیا تھا۔ اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ایبٹ آباد کا بھرا پرا شہر چھوڑ کر کسی دور دراز پہاڑی قصبے میں جا بسے۔ کھلی فضاؤں میں بسیرا کرے۔ قدرتی مناظر سے ہم کلام ہو اور کبھی کبھی اپنا وہ شوق بھی پورا کرے جو والدہ کی طویل علالت کے دوران میں اُس کے اندر کہیں دفن ہو گیا تھا۔ اُسے لکھنے لکھانے سے دلچسپی تھی۔ زمانہ طالب علمی میں وہ شعر جوڑتا تھا اور اُس نے چھوٹی موٹی کہانیاں بھی لکھی تھیں۔ پھر کارِ معاش کے سبب یہ سارے مشاغل چھوٹ گئے تھے۔

اُوپر والے نے اُس کی دُعا سن لی تھی۔ اُس کی تبدیلی ایبٹ آباد سے اس دُور دراز قصبے میں ہو گئی تھی۔ شروع میں اُسے یہاں اجنبیت ضرور محسوس ہوئی تھی لیکن اب وہ بہت خوش تھا۔

سنبل نامی اس اُداس لڑکی سے اُس کی صرف دو ملاقاتیں ہوئی تھیں مگر ان دو ملاقاتوں میں یہ لڑکی اُس کے دل و دماغ کو متاثر کر گئی تھی۔ اعجاز کو یوں لگا تھا جیسے اس لڑکی کے چہرے پر جلی حروف میں لکھا ہوا ہے کہ یہ لڑکی اپنے اندر کوئی گداز کہانی چھپائے ہوئے ہے۔ دو تین روز اعجاز اُس کے بارے میں سوچتا رہا، پھر اس سے اعجاز کی ایک اور ملاقات ہو گئی۔

یہ ملاقات بھی قریب قریب پہلی ملاقاتوں جیسی تھی۔ دوپہر کا وقت تھا لیکن شام کا سماں نظر آ رہا تھا۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ سر پر چھتری تانے اعجاز قریبی بستی کی طرف جا رہا تھا۔ پگڈنڈی پگڈنڈی چلتے اچانک اُسے اپنے عقب میں قدموں کی مدھم چاپ سنائی دی۔ اُس نے مڑ کر دیکھا، وہ پیچھے کھڑی تھی۔ بارش سے اُس کا لباس بھیگ گیا تھا اور اُس کا سرکش شباب بے حجاب نظر آنے لگا تھا۔ وہ چوبیس پچیس سال کی ایک بھرپور لڑکی تھی۔ ایک پکے ہوئے رسیلے پھل جیسی۔ وہ جس علاقے کی مکین تھی وہاں لڑکیوں کی شادیاں عموماً چودہ سے اٹھارہ سال کے درمیان ہو جاتی ہیں۔ سنبل ابھی تک غیر شادی شدہ تھی اور یہ اچنبھے کی بات تھی۔

''بابو! میرا کوئی خط تو نہیں آیا؟'' سنبل نے حسبِ معمول معصومیت سے پوچھا۔

اُس کی آواز نے اعجاز کو چونکا دیا۔ وہ سنبل سے نظریں ہٹا کر اُس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ جانے کیوں اُسے افسوس سا ہوا کہ آج بھی اُس کے پاس سنبل کے لئے کوئی خوش کن جواب نہیں ہے۔ ''نہیں بھئی! تمہارے نام کا تو کوئی خط نہیں۔'' وہ بولا۔

حسبِ معمول وہ بجھ سی گئی۔ اُس کے چہرے اور جسم میں جلتی ہوئی کوئی لو ایک دم اندھیرے میں کھو گئی۔ ''بابو جی! ذرا ٹھیک سے دیکھو تو۔''

اُس کا دل رکھنے کے لئے اعجاز نے یونہی خطوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ ساتھ ساتھ وہ نفی میں سر ہلاتا جا رہا تھا۔ وہ اُمید و بیم میں ڈوبی اُس کے سامنے تھی۔ اعجاز نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تم نے ایڈریس کیا دیا تھا؟''

''ایڈریس بالکل ٹھیک تھا بابو جی!''

''کیا پہلے کوئی خط آیا ہے؟''

''آیا تو نہیں۔ لیکن ایڈریس بالکل ٹھیک ہے اور..... وہ اچھی طرح جانتا بھی ہے۔''

اپنے خیال میں سوچا، چلو ایک بات تو صاف ہوئی کہ وہ کوئی مرد ہے۔ اب اگلا سوال یہ ہو سکتا ہے کہ کون مرد ہے؟ ابھی لڑکی کے ساتھ اُس کی اتنی بے تکلفی نہیں ہوئی تھی کہ وہ براہ راست یہ سوال پوچھ سکتا اور یہ پوچھ سکتا کہ وہ کہاں ہے اور کب سے اسے انتظار کروا رہا ہے؟

بارش کا رخ تبدیل ہو گیا تھا۔ اعجاز نے بھی تھوڑی سی تیزی کر لی۔ پھر ایک نظر بے ساختہ سنبل پر ڈالی اور آگے بڑھ گیا۔ کافی آگے جا کر اس نے ترچھی نظروں سے دیکھا۔ وہ ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔ اس کے اردگرد سبزہ ہی سبزہ تھا۔ اس سبزے پر بارش نے پردہ سا تان رکھا تھا۔ ایک آبشار کے پاس کھڑی وہ سنگ مرمر کی پتلی دکھائی دیتی تھی۔

اس واقعے کے بعد بھی وقفے وقفے سے چار پانچ دفعہ ایسا ہوا کہ سنبل نے اس سے اپنے خط کے بارے میں پوچھا۔ ہر مرتبہ اعجاز کا جواب نفی میں رہا۔ جب کوئی خط آیا ہی نہیں تھا تو وہ اثبات میں کیا جواب دیتا؟ اعجاز کے ذہن میں سنبل نامی اس لڑکی کے بارے میں شدید تجسس پیدا ہو چکا تھا۔ آخر وہ کس کے خط کی راہ تک رہی تھی؟ وہ کون تھا؟ کہاں رہتا تھا؟ وہ اتنی حسین و جمیل لڑکی کی خواہش پر کیوں اُسے خط نہیں لکھتا تھا؟ کیا وہ کوئی پردیسی تھا یا اسی قصبے کا کوئی ایسا فرد تھا جو کام کاج کی غرض سے بستی سے باہر تھا یا پھر یہ کوئی عشق و محبت کا معاملہ ہی نہیں تھا۔ سنبل اپنے کسی بھائی یا کسی قریبی عزیز کے خط کا انتظار کر رہی تھی؟

اعجاز جتنا سوچتا اُتنا ہی اُلجھتا تھا۔ اُس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ کوئی کہانی ضرور ہے۔ ایک روز چھٹی تھی۔ چاچا گلریز زمین پر کام کے لئے گیا ہوا تھا۔ اماں فاطمہ کی طبیعت ذرا ناساز تھی اس لئے وہ ملک خداداد کی حویلی نہیں گئی تھی۔ اعجاز نے اماں فاطمہ سے پوچھا۔

''اماں! یہ سنبل، ملک خداداد کی بیٹی ہے؟''

''ہاں بیٹی ہے۔ لیکن تو کیوں پوچھتا ہے؟''

''بس یونہی۔ وہ اتنی بڑی ہو گئی ہے ناں۔ میں سوچ رہا تھا اس کا بیاہ کیوں نہیں ہوا؟''

''وہ بیمار ہے۔''

''کیا ہوا اسے؟''

''بس کبھی کبھی اُسے بیماری کا دورہ سا پڑ جاتا ہے۔''

''مثلاً کیا ہوتا ہے؟''

''بس ٹھنڈی ٹھار ہو جاتی ہے۔ آنکھیں اوپر چڑھ جاتی ہیں۔ سانسیں رُکنے لگتی ہیں۔ ایڑیاں ہاتھ پاؤں کی مالش کریں تو ہوش میں آتی ہے۔''

''یہ تو کوئی ایسی خطرناک بیماری نہیں۔ اکثر کسی صدمے یا شدید پریشانی کی وجہ سے عورتوں کی یہ حالت ہو جاتی ہے۔''

''ہاں بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔ بیماری تو کوئی ایسی خطرناک نہیں۔ اور اگر ہوتی بھی تو سنبل جیسی لڑکی کی شادی میں کیا رکاوٹ ہو سکتی تھی؟ باپ بستی کا مالک ہے۔ اُس کے نام کا سکہ چلتا ہے۔ لاکھوں میں کھیلتا ہے۔ ایک پورا پہاڑ اُس کی ملکیت ہے۔ وہ آسانی سے بیٹی کے ہاتھ پیلے کر سکتا تھا۔ لیکن پتا نہیں کیوں وہ ایسا نہیں کرتا؟ سنا ہے کہ سنبل خود بھی بیاہ کرنا نہیں چاہتی بلکہ اُسے بیماری کا دورہ بھی اسی وقت پڑتا ہے جب اس سے بیاہ کی بات کی جاتی ہے۔ وہ ملک کی سب سے چھوٹی اور لاڈلی بیٹی ہے۔ ملک اُسے تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ شاید اسی وجہ سے اس نے سنبل کے بیاہ کی بات کرنا ہی چھوڑ دی ہے۔''

اعجاز بولا۔ ''اماں جی! میں نے تو سنا ہے کہ جوان بچے بچیوں میں کوئی اس طرح کی تکلیف ہو تو فوراً ان کی شادی کر دینی چاہئے۔ ویسے بھی یہ اللہ کا حکم ہے۔ اس میں بہتری ہی بہتری ہے۔''

اماں فاطمہ نے کہا۔ ''ہاں بیٹا جی! ہم بھی یہی سنتے اور دیکھتے آئے ہیں۔ پر سنبل ملک خداداد کی اولاد ہے۔ کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کی نہیں۔ اگر ہوتی تو اب یہی ملک صاحب یہ لمبا ڈنڈا لے کر اُس کے پیچھے پڑے ہوتے کہ وہ جوان جہان بیٹی کا بیاہ کیوں نہیں کرتا؟ کیوں اپنے اور سارے قصبے کے سر پر بوجھ بڑھا رہا ہے؟ مگر اب بات اُن کے اپنے گھر کی ہے اس لئے بالکل خاموش ہیں۔ کسی کو بھی یہ جرأت نہیں کہ اس بارے میں زبان کھولے۔''

اعجاز اب اماں فاطمہ سے کافی بے تکلف ہو چکا تھا۔ وہ اماں کے بارے میں سب کچھ جان چکا تھا اور اماں اُس کے بارے میں کافی کچھ جان چکی تھی۔ اُس نے اماں سے کہا۔

''کہیں اُس لڑکی کا کسی سے پیار محبت کا معاملہ تو نہیں تھا؟''

اماں فاطمہ کے چہرے پر رنگ سا گزر گیا۔ ''تو کیوں خواہ مخواہ ٹوہ لے رہا ہے؟''
اماں نے اُسے ٹوکا۔

''اس کا مطلب ہے کہ کوئی بات ہے ضرور؟''

''بیٹا! ایسی باتوں کو کریدا نہیں کرتے۔ اور پھر اگر بات کسی اُونچی پگڑی والے کی ہو تو اسے کریدنے میں اور بھی خطرہ ہوتا ہے۔''

''لیکن اماں! میں کسی اور سے تھوڑا کہہ رہا ہوں۔ تیری اور میری بات کوئی دو ہے؟''

اماں نے ٹھنڈی ہوا روکنے کے لئے کھڑکی بند کی اور قہوے کا ایک گھونٹ بھرتے ہوئے بولی۔ ''سات آٹھ سال پہلے اس طرح کی ایک بات ہوئی تھی۔ پہاڑی نالے کے ساتھ ساتھ سڑک نکل رہی تھی۔ شہر سے آنے والے بہت سے لوگ کام کر رہے تھے۔ انہوں نے نالے کے پاس ہی اپنی خیمہ بستی بنا رکھی تھی۔ اُن میں ایک لڑکا تھا۔ اُونچا لمبا گبرو۔ پتلون قمیص پہنتا تھا، بڑا ہنس مکھ تھا۔ سودا وغیرہ لینے اکثر بستی میں آیا کرتا تھا۔ اُس نے کہیں سنبل کو دیکھا اور اُس کے پیچھے پڑ گیا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی اور بات بڑھ گئی۔ ایک روز اُس نے سنبل کو جھاڑیوں میں روکنے کی کوشش کی۔ سنبل نے گھر آ کر باپ اور بھائیوں کو بتا دیا۔ اُنہوں نے لڑکے کو گھیر کر پکڑ لیا۔ پھر اُسے ترائی کے درختوں میں لے جا کر خوب مارا۔ اُس کے دونوں بازو ٹوٹ گئے اور جسم خونم خون ہو گیا۔ بعد میں قصبے کے لوگوں نے ہی لڑکے کو ہسپتال پہنچایا۔ وہاں وہ دو تین دن رہا، پھر اُس کے والی وارث اُسے راولپنڈی لے گئے۔ وہ بچ تو گیا لیکن پھر اُس نے کبھی قصبے کا رُخ نہیں کیا۔ بعد میں سنا تھا کہ اس لڑکے کا بیاہ بھی ہو گیا تھا۔''

اعجاز کا اندازہ درست نکلا تھا۔ کہانی موجود تھی۔ لیکن جتنی اعجاز تک پہنچی وہ بہت مختصر تھی۔ اعجاز کو تفصیل چاہئے تھی۔ یہ تفصیل اسے کون بتا سکتا ہے؟ اُس نے بڑی تیزی سے سوچا۔

اُس کا دھیان سیدھا رحیم گل کی طرف گیا۔ رحیم گل ڈاک خانے میں کلرک تھا اور اسی قصبے کا رہنے والا تھا۔ پچھلے دو اڑھائی مہینے میں اعجاز کے ساتھ اُس کی گہری دوستی ہو گئی تھی۔

اگلے روز شام کو اعجاز نے رحیم کو گھیر لیا۔ دریا کے کنارے گھاس کے ایک قطعے پر دونوں چادر بچھا کر بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ جلد ہی اعجاز اصل موضوع پر آ گیا۔ اُس نے سنبل کے حوالے سے رحیم گل کو کریدنے کی کوشش کی۔ رحیم گل کے چہرے پر

...ن تاثر چھپا ہوا جو گزشتہ روز اماں فاطمہ کے چہرے پر نظر آیا تھا۔ اس تاثر میں خوف و ہراس کی آمیزش بھی تھی۔ ظاہر ہے سنبل بستی کے مالک کی بیٹی تھی۔ اس کے بارے میں کوئی الٹی سیدھی بات منہ سے نکل جاتی اور ملک تک پہنچ جاتی تو قیامت آ جاتی۔

رحیم گل نے پہلے تو ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا۔ مگر جب اعجاز کا اصرار بڑھا تو وہ چپ کا دروازہ توڑنے پر آمادہ ہو گیا۔ اس نے بتایا کہ چھ سات سال پہلے ہائی وے ڈیپارٹمنٹ کے ایک ملازم کا نام سنبل کے ساتھ لیا گیا تھا۔ بعدازاں اس نوجوان کو سخت ہزیمت اٹھانا پڑی تھی۔ ملک اور اس کے دونوں بیٹوں نے نوجوان کو مار مار کر ادھ موا کر دیا تھا۔

اعجاز نے پوچھا۔ ''کیا سنبل بھی اس لڑکے میں دلچسپی لیتی تھی؟''

رحیم گل کے جواب نے اعجاز کو ایک دم مایوس کر دیا۔ وہ بولا۔ ''میرا خیال ہے ایسا نہیں تھا۔ اسے تم یکطرفہ کارروائی کہہ سکتے ہو۔ ممکن ہے کہ کچھ دن مزید گزر جاتے تو یہ یکطرفہ نہ رہتی۔ مگر بات بڑھنے سے پہلے ہی ملکوں نے ختم کر دی۔''

''لڑکا علاج معالجے سے ٹھیک ہو گیا تھا؟''

''ہاں! اس کے دونوں بازو ٹوٹے تھے۔ آپریشن کے بعد ہڈیاں جوڑ دی گئی تھیں۔''

''اماں فاطمہ کہتی ہے کہ وہ لڑکا پھر کبھی قصبے میں نظر نہیں آیا۔''

''اس میں اتنی جرأت ہی کہاں تھی؟ وہ لڑکا کیا تھا، بزدل بھیڑ تھی۔ ایسے عاشقوں میں اتنا دم نہیں ہوتا کہ کسی کو گرویدہ بنا سکیں۔ میں نے سنا ہے ایک مرتبہ ملک کے کچھ کارندوں نے اسے کیولائی میں پکڑ لیا تھا۔ شاید وہ وہاں کسی کام کے لئے آیا تھا۔ انہوں نے اسے خوب پیٹا، لکیریں نکلوائیں۔ کورے کاغذ پر انگوٹھے لگوائے اور پھر دھمکی دی کہ اگر وہ آئندہ کیولائی میں نظر آیا تو اس کی خیر نہیں۔'' اعجاز کی مایوسی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ اس کہانی میں تو کوئی جان نظر نہیں آتی تھی۔ رحیم گل نے اپنے موقف کی تائید میں مزید ثبوت دیتے ہوئے کہا۔ ''میری بڑی بہن کی اب شادی ہو چکی ہے۔ وہ سنبل کی سہیلی تھی۔ سہیلی سے تو کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہوتی۔ وہ خود مجھے بتایا کرتی تھی کہ سنبل کا اس لڑکے سے دور کا بھی تعلق واسطہ نہیں۔ وہ تو اسے لمبے بالوں والی بھیڑ کہتی تھی۔''

اعجاز نے کہا۔ ''ہاں، یوں بھی یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ اگر سنبل کا دل ڈانواں ڈول ہوتا تو وہ باپ کے سامنے اس لڑکے کی شکایت نہ کرتی۔''

"لیکن یار! تم کیوں اتنے کھوجی بنے ہوئے ہو؟" رحیم نے اعجاز کو ٹٹولتے ہوئے کہا۔

"پیارے! مجھے لکھنے کا ٹھرک ہے۔ کوئی کہانی ڈھونڈتا رہتا ہوں۔" اعجاز نے کہا۔

"سنبل کو تم نے کہاں دیکھا تھا؟"

"یونہی راہ چلتے ایک دو بار۔" اعجاز نے کہا۔ وہ یہ بات گول کر گیا کہ سنبل آتے جاتے اُس سے کسی خط کے بارے میں پوچھا کرتی ہے۔"

"بس وہ سنکی سی لڑکی ہے۔" رحیم نے آہستہ سے کہا۔ "باپ نے لاڈ پیار میں سر چڑھا رکھا ہے۔ بلکہ میرے خیال میں تو اب اُسے لڑکی بھی نہیں کہنا چاہئے۔ ایک دو سال میں وہ عورت کہلانے کی مستحق ہو گی۔ بھئی یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ لڑکی نہیں مانتی اس لئے اس کی شادی نہیں ہو رہی۔"

"اماں فاطمہ کہتی تھی کہ وہ بیمار ہے۔"

"کوئی بیماری شماری نہیں، بس لاڈ ہی لاڈ ہے۔" رحیم گل نے بیزاری سے کہا۔ "یہ ملک خداداد کی سب سے چھوٹی بیٹی ہے۔ چھوٹا بچہ پیار محبت میں اکثر خراب ہو جاتا ہے۔"

"کتنے بھائی ہیں اس کے؟"

"دو بھائی ہیں۔"

"اور بہنیں؟"

"تین ہیں۔ تینوں بھلی چنگی ہیں، بال بچے دار ہیں۔ اپنے اپنے گھر ہنسی خوشی رہتی ہیں۔ سنبل کی طرح ان تینوں نے آٹھویں جماعت پاس کی ہوئی ہے۔ قصبے کی لڑکیوں کے بارے میں اکثر باتیں نکلتی رہتی ہیں۔ ان تینوں کے بارے میں تو کوئی افواہ تک نہیں اڑی۔ ماں باپ نے بر ڈھونڈا۔ ماں باپ نے شادی کی۔ چپ چاپ ڈولی میں بیٹھیں اور رخصت ہو گئیں۔ ایک یہ لڑکی ہے کہ نئے نئے تماشے بنا رہی ہے۔ پتا نہیں کیا چاہتی ہے؟ بھئی اب تو زمانہ بدل گیا ہے۔ ماں باپ بچوں کی بات سننے لگے ہیں۔ ملک خداداد کتنا بھی سخت سہی لیکن اپنی لاڈلی پر تو کلہاڑا لے کر چڑھائی نہیں کرے گا۔ اگر وہ کسی کو چاہتی ہے تو بتا دے۔ کیا پتا بات بن ہی جائے اُس کی۔"

اعجاز نے کہا۔ "رحیم گل! مجھے تو یقین ہے کہ لڑکی کا کوئی چکر ہے۔ اگر کوئی پوچھنے والا ہو تو بتا دے گی اُس کو۔"

رحیم نے کہا۔ ''یار! تجھے بتایا تو ہے۔ ہم ان کے پڑوسی ہیں۔ میری بہن صادقہ اُس کی سہیلی تھی۔ اگر کوئی بات ہوتی تو اُسے پتا نہ ہوتا؟''

''ممکن ہے یہ تمہاری بہن کی شادی سے بعد کی بات ہو۔''

''میری بہن کی شادی دو برس پہلے ہوئی تھی۔ لیکن یہ تو چھ سال سے ایسے ہی ملنگ ہے۔'' ملنگ کا لفظ رحیم گل نے خوب استعمال کیا تھا۔ اعجاز دل ہی دل میں مسکرایا۔ واقعی سنبل کو دیکھ کر ایک خوبصورت ملنگ کا تصور ذہن میں آ جاتا تھا۔ ایک پری پیکر ملنگ جس نے پتھر پر بیٹھ کر اپنے دودھیا پاؤں بہتے پانی میں ڈبو رکھے تھے۔

○

وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ ہاں وہ وقت ہی تھا۔ وہ ہوا کے ساتھ چیڑ کے درختوں میں سرسراتا اور پانی کے ساتھ چشموں میں بہتا رہا اور بادلوں کے ساتھ پربتوں پر اُڑتا رہا۔ لمحے دنوں، ہفتوں اور مہینوں میں بدلتے رہے۔ اعجاز اب علاقے سے اور علاقے کے مکینوں سے بہت مانوس ہو چکا تھا۔ وہ ہر شخص کو جاننے پہچاننے لگا تھا۔ ہر شخص کی عادات، خصائل اور پس منظر کے بارے میں اُسے معلومات حاصل ہو چکی تھیں۔ اگر کوئی اس کے لئے اب بھی اجنبی تھا تو یہ وہی سنبل تھی۔ وہ اُسے جان سکا تھا نہ سمجھ سکا تھا۔ وہ اکثر اُداس سہ پہروں میں اُسے کسی پتھر پر بیٹھی ملتی۔ کسی چشمے کے اندر اُس نے اپنے پاؤں بہتے پانی میں ڈبو رکھے ہوتے یا پھر ترائی میں چیڑ کے دیو قامت درختوں تلے وہ برہنہ پا چکراتی نظر آ جاتی۔ ہمیشہ اعجاز کو دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں ایک چمک نمودار ہو جاتی۔ ایک آس بھری چمک جس سے اعجاز کو اب ڈر آنے لگا تھا۔ اسے کبھی کبھی محسوس ہوتا تھا جیسے لڑکی کا گناہگار وہ شخص نہیں جو اُسے خط لکھنا بھول گیا ہے۔۔ وہ خود ہے جس کے تھیلے میں سے اُس کے لئے کوئی خط نہیں نکلتا۔ وہ اکثر اس سے نظر بچا کر گزر جاتا۔ لیکن کبھی کبھی آمنا سامنا ہو ہی جاتا۔ سنبل کی آنکھوں میں موہوم امید ٹمٹماتی۔ وہ پوچھتی۔ ''ہے کوئی خط؟''

اعجاز کی خاموشی ہی اُس کا جواب ہوتی تھی۔ یہ جواب دینے کے بعد وہ اس کے چہرے کی طرف دیکھنے کی زحمت نہیں کرتا تھا۔ اُس میں اتنی سکت ہی نہیں ہوتی تھی کہ اس کے چہرے کی طرف دیکھتا۔ کبھی کسی وقت وہ دانستہ طور پر سنبل کے سوال سے بچنے کی

وشش [illegible] سے بولنے سے پہلے ہی بول اٹھتا کہ آج بھی اس کے نام کا کوئی خط نہیں، یا پھر نفی میں سر ہلا دیتا۔ بہرحال یہ خط والا معاملہ اعجاز اور سنبل کے درمیان ایک راز کی حیثیت رکھتا تھا۔ بہت کم ایسا ہوا تھا کہ کسی نے سنبل یا اعجاز سے خط کے بارے میں دریافت کرتے دیکھا یا سنا ہو۔ اور اگر کوئی جان بھی جاتا تو اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ملک خداداد کی بیٹی کے بارے میں کوئی الٹی سیدھی بات نکالتا۔

اکثر اعجاز کے دل سے یہ دعا نکلتی کہ وہ خط آ ہی جائے جس کا سنبل اتنی بے چینی سے انتظار کیا کرتی ہے۔ وہ پوسٹ آفس سے روزانہ درجنوں خطوط تھیلے میں [illegible] لاتا تھا۔ ان میں ہر طرح کے خطوط ہوتے تھے اور ایسے خطوط بھی جو چھپا کر لکھے جاتے ہیں اور چھپا کر پڑھے جاتے ہیں۔ ان میں سے کچھ خط ان پردیسیوں کے ہوتے تھے جو اپنے بال بچوں سے دور کسی دوسرے شہر میں کام کاج کے لئے گئے ہوتے تھے۔ کچھ منگیتروں کے خط ہوتے تھے، کچھ محبوباؤں کے نام ہوتے تھے۔ کچھ بیٹیوں کی چٹھیاں ہوتی تھیں۔ اعجاز اکثر سوچتا تھا کہ کتنا اچھا ہو اگر ان میں ایک چٹھی سنبل کے نام کی بھی آ جائے۔ پوسٹ آفس میں "سارٹنگ" کے دوران میں اکثر اس کی نگاہ سنبل کا نام تلاش کرتی رہتی۔

ایک شام چیڑ اور کیل کے گھنے درختوں سے گزرتے ہوئے اس نے سنبل کو دیکھا وہ [illegible] پھولوں سے چھوٹا سا گلدستہ بنا رہی تھی۔ اعجاز کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ اعجاز شام کی سیر کو نکلا [illegible] موڈ میں تھا۔ وہ پاس ہی گھاس کے ایک قطعے پر بیٹھ گیا اور ندی کے شفاف پانی میں اپنے کپڑے اور جوتے دھونے لگا۔ وہ اسے محویت سے دیکھنے لگی۔

اعجاز نے کہا۔ "ایک بات پوچھوں سنبل بی بی! برا تو نہیں مانو گی؟"

"ہاں ہاں، آپ پوچھو!" وہ جیسے کسی خیال سے چونک کر بولی۔

"وہ کس کا خط ہے جس کا تم روز انتظار کرتی ہو؟"

"یہ بتانا ضروری ہے؟"

"ضروری تو نہیں، لیکن اتنا عرصہ گزر گیا ہے۔ میں اکثر اس کے بارے میں اور تمہارے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔"

وہ ایک طویل سانس لے کر بولی۔ "ایک سہیلی ہے میری..... بیاہ کر بہت دور چلی گئی ہے۔"

"کہاں؟"

''لاہور۔ شاید لاہور سے بھی آ گئے۔''

''تمہارے پاس اُس کا ایڈریس نہیں ہے؟''

''ہوتا تو خط نہ لکھتی اُسے؟''

اعجاز کے ذہن میں کوئی بات آئی۔ وہ بولا۔ ''میری بات کا برا نہ ماننا! مجھے لگتا ہے کہ تم غلط کہہ رہی ہو۔''

''کیا مطلب؟''

''وہ سہیلی نہیں ہے۔'' سنبل نے کڑی نظروں سے اُسے گھورا۔ ان لمحوں میں وہ سچ مچ ملک خداداد کی بارُعب بیٹی نظر آئی۔ اعجاز پہلے تو ٹھٹکا، پھر سنبھل کر بولا۔ ''ایک مرتبہ خود تمہاری زبان سے ایک ایسا جملہ نکل گیا تھا جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کوئی لڑکی نہیں۔''

''کیسا جملہ؟''

''مجھے وہ جملہ اب تک یاد ہے۔ تم نے کہا تھا کہ تم جس کے خط کا انتظار کر رہی ہو، وہ تمہارا ایڈریس اچھی طرح جانتا ہے۔''

سنبل نے گھور کر اُسے دیکھا۔ اعجاز گڑبڑا گیا۔ یہ رسک ہی کم نہیں تھا کہ وہ قصبے کے بااثر ترین شخص کی بیٹی سے باتیں کر رہا تھا۔ اب یہ دوسرا خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ اس سے برہم ہونے والی ہے۔ بہرطور خیریت گزری۔ دُور سے اُسے رحیم گل اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ اُسے دیکھ کر سنبل نے رُخ پھیرا اور قصبے کی طرف چل دی۔

رحیم گل نے کہا۔ ''یہاں کیا کر رہا ہے پیارے؟''

اعجاز نے بتایا کہ جوتے کیچڑ میں لتھڑ گئے تھے۔ وہ دھو رہا تھا۔

دونوں وہیں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ رحیم گل نے ڈھکے چھپے الفاظ میں اعجاز کو تنبیہ کی کہ وہ ملک خداداد کی بیٹی کے پاس زیادہ نظر نہ آیا کرے۔ وہ بہت شکی مزاج اور غصیلے لوگ ہیں۔ ذرا سی بات پر بندے کی گردن اُڑا دیتے ہیں۔

اعجاز نے کہا۔ ''یار! تم کیسی بات کر رہے ہو؟ میرے دل میں اس قسم کا کوئی خیال نہیں ہے۔ میں تو بس اپنے ہی چکر میں ہوں۔''

''کیسے چکر میں؟''

''کہانی کے چکر میں۔ مجھے یقین ہے کہ اس لڑکی کے ساتھ کوئی کہانی ہے۔ وہ اس

کہانی کو اپنے اندر چھپائے پھرتی ہے۔ کوئی ہے۔۔۔ ہاں کوئی ہے جس کے آنے کا، جس کے خط کا وہ انتظار کیا کرتی ہے۔''

''یار! اگر ہے بھی تو، تو کیوں خواہ مخواہ اس معاملے میں ٹانگ اڑاتا ہے؟''

''نہیں پیارے! میں رہ نہیں سکتا۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کون ہے؟''

''بس تو پھر ٹھیک ہے۔ کسی دن اُسے جنگل میں گھیر لے۔ نائیلون کی رسّی کے ساتھ اُسے درخت سے باندھ دے اور چیڑ کا ڈنڈا لے کر اُس کے سر پر کھڑا ہو جا۔ پوچھ اس سے کہ کون ہے اس کا پریمی۔۔۔ اور کیا ہے پریم کہانی۔''

''یار! تم تو غصہ کر رہے ہو۔ اچھا میری ایک بات سنو۔ تم نے بتایا تھا کہ تمہاری بڑی بہن صادقہ اس اول جلول لڑکی کی گہری سہیلی رہی ہے۔ جو بات کسی کو معلوم نہیں ہوتی وہ سہیلی کو پتا ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ روڈ ڈیپارٹمنٹ کے ملازم شفیع کے علاوہ بھی کسی سے سنبل کا تھوڑا بہت تعلق جوڑا گیا ہو۔ عام لوگوں کو معلوم نہ ہو لیکن سنبل کے گھر والوں یا اس کی ایک دو قریبی سہیلیوں کو معلوم ہو۔''

رحیم گل گہری نظروں سے اعجاز کو دیکھنے لگا۔ شاید اُس کی کھوجی طبیعت پر کوئی فقرہ چست کرنا چاہتا تھا۔ چند لمحے بعد اُس نے گہری سانس لی اور بولا۔ ''ویسے تمہارا اندازہ درست ہے۔ میرا بھی خیال ہے کہ شفیع کے علاوہ بھی سنبل کا نام ایک نوجوان کے ساتھ آیا تھا۔ یہ بات زیادہ اہم نہیں اور نہ ہی زیادہ پھیلی تھی۔ مگر بات تھی ضرور۔''

''کون تھا وہ؟''

''ایک مقامی نوجوان۔''

''بہن صادقہ ہمیں اس بارے میں تفصیل سے آگاہ کر سکتی ہے۔''

''اُس کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ میں خود تمہیں تفصیل سے آگاہ کر سکتا ہوں۔ اور تفصیل بھی کیا ہے، بس مختصر سی بات ہے۔''

''یعنی تم اس بارے میں جانتے ہو۔''

''کیوں نہ جانوں گا۔ اپنے بارے میں کون نہیں جانتا؟''

''کیا مطلب؟''

''میں ہی تو ہوں وہ۔'' رحیم گل عجیب انداز میں مسکرایا۔

اعجاز چند لمحے دیدے پھاڑ کر اُس کی جانب دیکھتا رہا۔ حیرت کچھ کم ہوئی تو اُس نے رحیم گل سے تفصیل چاہی۔ رحیم گل کی روداد بڑی مختصر تھی۔ مختصر الفاظ نے اسے مزید مختصر کر دیا۔ جب رحیم نے روداد شروع کی تو اعجاز خاصا پُراُمید تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ آخر اسے وہ کہانی مل گئی جس کی تلاش میں وہ سرگرداں تھا، لیکن جب یہ روداد ختم ہوئی تو اعجاز کا اولین تاثر مایوسی کا تھا۔ بالکل ویسی ہی مایوسی جیسی اُسے روڈ ڈیپارٹمنٹ کے شفیع کی کہانی سننے کے بعد ہوئی تھی۔ رحیم کی روداد کا خلاصہ یوں تھا کہ سنبل، رحیم کی بہن کی سہیلی تھی۔ اس ناتے وہ اکثر اُن کے گھر بھی آتی تھی۔ ویسے بھی وہ پڑوسی تھے۔ سنبل جتنی خوبصورت آج نظر آتی تھی، پانچ چھ سال پہلے اس سے بھی بڑھ کر تھی۔ حسن اور شباب کا ساتھ ساتھ بات۔ رحیم سنبل کی طرف کھنچنے لگا۔ دو چار مرتبہ اُس نے اشاروں کنایوں میں سنبل سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے حوصلہ افزائی نہیں کی۔ ایک مرتبہ رحیم چھت پر سے اشارے کر رہا تھا کہ رحیم کے والد نے دیکھ لیا۔ اُپلوں والی کوٹھڑی میں بند کر کے والد نے اُسے تھپڑ رسید کئے اور بری طرح ڈرایا دھمکایا۔ اُس نے کہا، تو ایک معمولی کلرک کا لڑکا بنتا ہے۔ وہ ملک خداداد کی بیٹی ہے۔ ان لوگوں کے کان میں بھنک بھی پڑ گئی تو تجھ سمیت پورے گھر کو آگ لگا دیں گے۔

اس واقعے کے بعد رحیم کے جذبات پر اوس پڑ گئی۔ رہی سہی کسر دو تین ماہ بعد پوری ہوئی۔ شام کے وقت کھیت کے درمیان سے گزرتے ہوئے ایک پگڈنڈی پر کسی زہریلے کیڑے نے رحیم کے پاؤں پر کاٹ لیا۔ وہ وہیں لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ اتفاقاً سنبل دریا کی طرف سے وہاں آگئی۔ اُس نے رحیم کے پاؤں کا نیلا نشان دیکھا تو فوراً اپنا دوپٹہ اُس کی پنڈلی پر باندھا اور کپڑے کا ٹوٹا ہوا ڈنک نکال دیا۔ بعد میں انگوٹھے سے زہر آلود خون نکالنے میں بھی اس نے رحیم گل کی مدد کی۔ رحیم گل نے مشکل وقت میں مدد کرنے پر سنبل کا شکریہ ادا کیا تو وہ بولی۔ ''بہنیں بھائیوں کے کام آیا ہی کرتی ہیں۔ تم صادق کے سگے بھائی ہو تو میرے لئے بھی سگے بھائیوں کی طرح ہو۔''

اس کے بعد یہ بات ختم ہو گئی تھی۔ سنبل نے بڑے خلوص سے اُسے بھائی کا درجہ دے دیا۔ اب باقی کیا رہ گیا تھا۔

رحیم گل کی کہانی سننے کے بعد اعجاز کی اُلجھنوں میں کمی ہونے کی بجائے اضافہ ہو گیا۔ یہ

لڑکی اس کے لئے ایک معمہ بنتی جا رہی تھی۔ وہ جتنا اس کی طرف سے دھیان ہٹانے کی کوشش کرتا تھا، اتنا ہی اس کے بارے میں سوچنے لگتا تھا۔ اس حسین قصبے میں رہتے ہوئے اعجاز کو اب تین سال ہونے کو آئے تھے۔ ان تین سالوں میں اگر وہ قصبے کے کسی شخص کو نہیں سمجھ سکا تھا تو وہ سنبل تھی۔ وہ تھوڑی سی کھسکی ہوئی لگتی تھی۔ لیکن اُس کا یہ انداز بھی دل کو بھاتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس لڑکی میں رُومانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ وہ سرتاپا ایک خوبصورت خواب کی مانند تھی۔ ایسا خواب جو اپنے سحر انگیز گردو پیش کی وجہ سے کچھ اور بھی دلکش ہو گیا تھا اور یہ حسین و جمیل لڑکی کسی کہانی کا کردار تھی، ایک ایسے خط کا انتظار کر رہی تھی جو بلند و بالا پہاڑوں کے پار سے اُسے کوئی بھیجنے والا تھا...... یا ان گھنے جنگلوں کے پار سے جو مغربی ڈھلوانوں پر نظر آتے تھے، یا ان چمکتی برفوں کے پار سے جو شمال میں حدِ نگاہ تک چلی گئی تھیں.... ہاں کہیں نہ کہیں سے اس خط کو آنا تھا۔ پھر اس خط کو پوسٹ آفس میں پہنچنا تھا اور اعجاز کے خاکی تھیلے میں منتقل ہونا تھا۔ مگر کب.. کب ہونا تھا ایسا؟ شاید تب، جب انتظار کی لذت ختم ہو جانا تھی۔ جب بالوں میں سفیدی اُتر آنا تھی۔ جب سنبل کا حسن اپنے اندر کی آگ میں جل کر راکھ ہو جانا تھا وہ سوچتا اور سوچتا ہی چلا جاتا۔ ایسے میں سنبل اپنی تمام تر تابانیوں کے ساتھ اُس کے تصور میں آ جاتی۔ وہ دلکش، ملنگ طبع حسینہ۔ اعجاز کبھی اُسے چیڑ کے بلند و بالا درختوں تلے دیکھتا، کبھی وہ جنگلی پھولوں کے گلدستے بناتی نظر آتی اور کبھی پُر شور دریا کے کنارے کسی پتھر پر بیٹھی دکھائی دیتی۔ اُس کے پاؤں دو گلابوں کی طرح پانی میں ڈوبتے اُبھرتے اور وہ خود بھی انجانی سوچوں میں ڈوبتی اُبھرتی۔

جون کی ایک بڑی سہانی صبح تھی۔ کئی دن کی بارش کے بعد آسمان نکھرا ہوا تھا اور خوشگوار دھوپ نشیب و فراز کو اپنی مہربان اُنگلیوں سے سہلا رہی تھی۔ اعجاز آج بہت خوش تھا۔ ایک تو چھٹی کا دن تھا۔ دوسرے کل ہی اُسے اپنی ترقی کا پروانہ ملا تھا۔ وہ پوسٹ مین سے ہیڈ پوسٹ مین بن رہا تھا۔ معمولی سا فرق تھا۔ لیکن ایسا فرق اچھا تو لگتا ہے۔ صبح سویرے اماں فاطمہ سے چھاچھ، مکھن اور روٹی کا ناشتہ کر کے وہ دریا کی طرف چلا آیا۔ دریا کے ساتھ ساتھ اکیلے گھومنا اُسے اچھا لگتا تھا۔ وہ سنبل کے بارے میں بہت سوچتا تھا شاید اسی لئے اُس پر سنبل کا رنگ چڑھتا جا رہا تھا۔ اُسے بھی تو ان سرسبز نشیب و فراز میں

اپنے لمبومنا اچھا لگتا تھا۔

دریا کے ساتھ ساتھ ابھی اعجاز تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ ایک آواز سن کر چونک گیا۔ یہ
نسوانی آواز تھی۔ یقیناً تفریحی ٹور پر آئے ہوئے لڑکوں کی کوئی ٹولی شوگران یا کاغان
کی طرف جاتے ہوئے یہاں ٹھہر گئی تھی۔ وہ موسیقی سے دل بہلا رہے تھے۔ ایک سریلی
نسوانی آواز فضا میں گونج رہی تھی۔ اعجاز ایک پتھر کی اوٹ میں رک گیا اور محویت سے
سننے لگا۔ بول کچھ اس طرح کے تھے۔

چلو چلیں، اے دل کریں چل کر کسی کا انتظار جھیل کے اس پار

ہو اس پار نہیں کوئی، شاید وہ اس پار ہو

جھیل کے پیچھے اک سندر سپنوں کا سنسار ہو

آئی ہو بہاروں پر بہار جھیل کے اس پار

اس آواز نے اعجاز پر ایک عجیب سی کیفیت طاری کر دی۔ اسے یوں لگا جیسے ایک
عقدہ سا اس کی آنکھوں کے سامنے کھلتا چلا جا رہا ہے۔ اس عقدے کا تعلق اس
خوبصورت سنبل سے تھا جسے وہ پچھلے تین سال سے مسلسل دیکھ رہا تھا۔ گانے کی شاعری
عام نظم تھی۔ اس شاعری سے ایک خاص چیز کا اظہار ہوتا تھا۔ لڑکی جس کا انتظار کر رہی تھی
وہ کوئی مخصوص شخص نہیں تھا۔ وہ کوئی بھی ہو سکتا تھا اور کہیں بھی پایا جا سکتا تھا۔ بس وہ تھا...
اور وہ اس کی منتظر تھی۔ ان عقدہ کشا لمحات میں اس پرسوز آواز کو سنتے سنتے اعجاز پہ یہ راز
کھلا اور اسے یقین ہو گیا کہ سنبل کے پیچھے کوئی کہانی نہیں۔ وہ ایک ایسے خط کا انتظار کر
رہی ہے جو کہیں سے بھی آ سکتا ہے۔ جنوب کے پہاڑوں کے پار سے، شمال کی برفوں کے
پار سے اور ان بلند و بالا درختوں کے پار سے جو مغرب میں حد نگاہ تک پھیلے ہوئے ہیں۔

اعجاز وہیں پتھروں پر بیٹھ گیا اور حیرت ناک نظروں سے دریا کے بہتے پانی کو دیکھنے
لگا۔ وہ تیزی سے سوچ رہا تھا اور اس کی سوچ گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ اس کے
علم میں اضافہ کر رہی تھی۔ وہ وہیں بیٹھے بیٹھے سنبل کی تحلیل نفسی میں مصروف ہو گیا۔ وہ
ایک رومان پسند لڑکی تھی۔ رومانیت کے لئے اس کے اندر ایک وسیع و عریض خلا تھا۔ مگر
یہ خلا کون پاٹتا؟ قصبے کے کس نوجوان میں ہمت تھی کہ وہ اس خلا کو پاٹنے کے لئے آگے
بڑھتا؟ وہ ملک خداداد کی بیٹی تھی۔ اس کی طرف نگاہ غلط انداز ڈالنے کا مطلب اپنی

گردن میں محروم ہوتا تھا۔ وہ ہر ایک کی دسترس سے باہر تھی۔ لہٰذا ایک بلند و بالا چوٹی کی طرح تنہا بیٹھی تھی۔ وہ قصبے کی دوسری دوشیزاؤں کو دیکھتی تھی۔ اُن کے امنگ ترنگ بھرے واقعات سنتی تھی، اُن کے گالوں پر کھلے گلاب دیکھتی تھی اور مزید تنہا ہو جاتی تھی۔ وہ تازہ معطر ہوا چاہتی تھی جبکہ اُس کے والدین اُس کے لئے گھٹن کا اہتمام کر رہے تھے۔ اُس کی ضرورت محبت تھی جبکہ اُسے ''شادی'' دی جا رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب اُس سے شادی پر اصرار کیا جاتا تھا تو وہ شدید ذہنی انتشار کا شکار ہو جاتی تھی اور اُس پر بیماری کا حملہ ہو جاتا تھا۔

اس دن اعجاز صرف اور صرف سنبل کے بارے میں سوچتا رہا۔ پھر اگلے دن اور اُس سے اگلے دن بھی سنبل ہی اُس کے خیالوں پر محیط رہی۔ تیسرے روز شام کو اعجاز نے ایک اہم فیصلہ کیا۔۔۔ اُس نے فیصلہ کیا کل کی ڈاک میں ایک خط سنبل کے نام کا ضرور ہوگا!

○

وہ اعجاز کے لئے ایک یادگار لمحہ تھا۔ یہی وہ لمحہ تھا جس کا وہ تین برس سے انتظار کر رہا تھا۔ آج اُس کے تھیلے میں ایک خط سنبل کے نام کا موجود تھا۔ یہ اعجاز ہی کا لکھا ہوا خط تھا۔ تین برس تک وہ سنبل سے نظریں چراتا رہا تھا۔ آج وہ سنبل کو ڈھونڈ رہا تھا۔ تین برس اُس نے جس سوال کا جواب نفی میں دے کر سنبل کو مایوس کیا تھا آج وہ اس کا جواب ہاں میں دینا چاہتا تھا۔

اور پھر وہ اُسے نظر آ گئی۔ وہ ایک مینا گود میں اُٹھائے دھیمے قدموں سے کھیت کی طرف جا رہی تھی۔ اُس کے لمبے بال کسی سیاہ آبشار کی طرح اُس کی پشت پر لہرا رہے تھے۔ اعجاز کو دیکھ کر وہ حسبِ عادت رُک گئی۔ وہیں کھڑی اُس کا انتظار کرتی رہی۔ جب وہ پاس آیا تو صدیوں کی پیاسی آواز اُس کے ہونٹوں سے سوال بن کر ابھری۔

''ہے کوئی خط؟''

اعجاز نے ایک لمحہ توقف کیا۔ پھر کانپتی آواز میں بولا ''ہاں''

سنبل کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا، خوبصورت آنکھیں پھیل گئیں۔ سفید مینا ایک جھٹکے سے اُس کی بانہوں میں سے نکل گیا اور ڈھلوان پر دور تک بھاگتا چلا گیا۔ وہ دل پر ہاتھ رکھ کر

بولی۔ "کوئی خط ہے میرے نام کا؟"

"ہاں سنبل! کہہ تو رہا ہوں کہ ہے۔"

وہ اپنی جگہ جامد ہو گئی تھی۔ ایک لرزش سی سرتاپا اُس کے جسم میں دوڑ رہی تھی۔ اعجاز نے تیر ساری رجسٹریوں، پارسلوں اور خطوں میں سے ایک خط علیحدہ کیا اور سنبل کی طرف بڑھا دیا۔ ایک لمحہ ٹھٹک کر اُس نے خط تھام لیا۔ اُس کے چہرے پر عجیب سی کیفیت تھی۔ حیرت اور خوشی یوں آپس میں گڈمڈ ہو گئی تھیں کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ممکن نہیں تھا۔

اعجاز اُسے وہیں کھڑے چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

○

اماں فاطمہ اور چاچا گلریز بہت پوچھتے رہے لیکن اعجاز نے رات کا کھانا نہیں کھایا۔ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے کئی ہفتوں تک وہ کچھ نہیں کھا سکے گا۔ سرِشام ہی وہ اپنے کوارٹر میں سونے کے لئے چلا گیا۔ جو مختصر خط اُس نے سنبل کے نام لکھا تھا، اُس کی نقل اُس کے پاس موجود تھی۔ اُس نے گھٹنوں تک لحاف کھینچا، لالٹین کی لو ذرا اونچی کی اور خط پڑھنے لگا۔

"یاد نہیں سنبل! میں نے سب سے پہلے تمہیں کب اور کہاں دیکھا تھا؟ لیکن مجھے یقین ہے کہ جب اور جہاں بھی دیکھا تھا، میں پہلی نظر میں ہی تم سے پیار کرنے لگا تھا۔ پہلے پہل اس پیار کا خود مجھے بھی علم نہیں تھا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس پیار کا جادو میرے سر چڑھ کر بولنے لگا۔ میں نے بے شمار راتیں تمہارے بارے میں سوچتے ہوئے گزاری ہیں سنبل میرے بے شمار دن صرف اور صرف تمہارے خیالوں سے عبارت رہے ہیں۔ میرا دل ایک پتھر کی طرح سخت ہو چکا تھا مگر تم جانتی ہو جب پتھر پر لکیر پڑتی ہے تو وہ بڑی پائیدار ہوتی ہے۔ سنبل! تمہارے حسن نے میرے دل پر بھی ایک بہت گہری لکیر کھینچ دی ہے۔ ایک بہت گہرا نقش بنا دیا ہے۔ میرے لفظوں کو صرف الفاظ مت سمجھنا۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ تمہارے بغیر زندہ رہنا میرے لئے ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔ میں جانتا ہوں، میں تمہارے مرتبے کا نہیں۔ میں ایک معمولی ملازم ہوں اور تم ملک خداداد کی بیٹی ہو۔ مجھے یہ بھی پتا ہے کہ میری اس جسارت کا نتیجہ میری موت کی صورت میں بھی نکل سکتا ہے۔ لیکن میں نے سب اندیشے بالائے طاق رکھ دیئے ہیں اور

اپنے دل کی بات تم تک پہنچا دی ہے۔ اب اس کا نتیجہ جو بھی نکلے گا، مجھے دل و جان سے قبول ہے۔ اگر تمہارے دل میں میرے لئے تھوڑی سی بھی جگہ ہے تو مجھے مایوس مت کرنا۔ میں آج دن بھر جاگتی آنکھوں سے یہ خواب دیکھتا رہا ہوں کہ رات کے اندھیرے میں تم نے خود کو محبت کی ڈورسے باندھا ہے اور اپنے آپ کو"خود" ہی کھینچ کر میری طرف لا رہی ہو۔ تمہارے ہاتھ میرے کوارٹر کے بوسیدہ دروازے پر دستک دے رہے ہیں۔ محبت کی دستک۔ جس کے لئے میرے کان برسوں سے ترس رہے ہیں۔"

تمہارا منتظر

آج بھی . کل بھی اور زندگی کی آخری سانس تک

اعجاز احمد

خط پڑھنے کے بعد اُس نے تہ کر کے تکیے کے نیچے رکھا۔ سردی آج معمول سے زیادہ تھی۔ اُس نے لحاف سینے تک کھینچا اور لالٹین کی لو مدھم کر دی۔ وہ سوچنے لگا، کہیں اُس نے خط میں کسی جگہ مبالغے سے تو کام نہیں لیا؟ کیا واقعی وہ شروع ہی میں سنبل سے محبت کرنے لگا تھا؟ ایک ایسی محبت جس کا اُسے خود بھی علم نہیں تھا۔ وہ بظاہر سنبل کے اندر ایک کہانی تلاش کر رہا تھا اور لاشعوری طور پر خود ایک کہانی کا کردار بنتا رہا؟ اس سوال کا جواب ہاں میں تھا۔ اُس نے خط میں کہیں بھی مبالغے سے کام نہیں لیا تھا۔

لحاف کی حرارت اُسے خوشگوار محسوس ہوئی۔ وہ فطرتاً ایک دلیر شخص تھا ورنہ ایسی صورتِ حال میں یوں ٹانگیں پسار کر بستر پر دراز نہ ہو جاتا۔ اُس نے اپنے دل کی بات کاغذ پر منتقل کر دی تھی۔ اب وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ نجانے کیوں اُسے یقین تھا کہ آج رات کمرے کے دروازے پر دستک ضرور ہوگی۔ لیکن یہ یقین نہیں تھا کہ یہ دستک کس قسم کی ہوگی؟ یہ دستک دو طرح کی ہو سکتی تھی۔ ایک مدھم، نازک سرگوشیاں کرتی ہوئی جن میں چوڑیوں کی چھن چھن ساز کی طرح اُبھر رہی ہو... یا بہت بلند، کرخت اور بے رحم دستک۔

پہلی دستک کا تعلق سنبل سے تھا اور دوسری کا ملک خداداد اور اُس کے بیٹوں سے۔ یقینی بات تھی کہ دونوں دستکوں کے بعد پیش آنے والے حالات بھی یکسر مختلف ہوں گے۔ وہ ان دونوں دستکوں کے بارے میں سوچتا رہا اور اپنے انجام کے بارے میں غور

بار بار۔ اس کے کان معمولی سے معمولی آہٹ بھی لے رہے تھے۔ نظریں دروازے پر لگی ہوئی تھیں... کی طرف دیکھتے دیکھتے اسے اونگھ سی آنے لگی۔ ذہن بس دو دستکوں کے درمیان بھٹک رہا تھا: چوڑیاں چھن چھن بجتی ہوئی دستک یا گرجتی ہوئی اور غراتی والی دستک۔ اس کی زندگی انہی دو دستکوں کے درمیان معلق ہو چکی تھی۔

وہ رات کا نجانے کون سا پہر تھا، اعجاز اونگھ رہا تھا۔ اچانک اس کے قیافے درست ثابت ہوئے۔۔ دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ وہ ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا، بلکہ اچھل پڑا۔ یہ ایک بڑی زوردار دستک تھی، غراتی اور دھاڑتی ہوئی۔ کمرے کی دیواروں کو ہلاتی ہوئی۔ چند لمحے کے لئے اعجاز کے جسم میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ پھر اس نے ایک گہری سانس لی اور بے جان لیکن نپے تلے قدموں سے دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ سامنے چاچا گلریز خاں کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی۔

وہ ایک جانب ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ دیکھ! کیا ہوا ہے؟''

اعجاز نے حیرت سے گنگ ہو کر دیکھا، کوارٹر سے باہر سائبان تلے کوئی پہلو کے بل گرا ہوا تھا۔ یہ سنبل تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں، ہاتھ اینٹھے ہوئے تھے اور وہ گہری سانسیں لے رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اعجاز کی سائیکل بھی گری ہوئی تھی۔

چاچا گلریز بولا۔ ''چلو اس کو اٹھاؤ! اندر لے چلو۔''

انہوں نے سنبل کو سنبھال کر اندر لے آئے۔ چاچا گلریز اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال بولا۔ ''یہ کیا معاملہ ہے؟''

''میں ابھی بتاتا ہوں چاچا ... تم ... پانی لے کر آؤ۔''

چاچا پانی لے کر آیا اور سنبل کے چہرے پر چھینٹے دینے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ بول رہا تھا۔ ''غضب خدا کا ... وہ تو سائیکل کے گرنے کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی ورنہ یہ تو باہر ہی پڑی پڑی اکڑ جاتی۔ مگر یہ یہاں آئی کیسے؟ نہیں... کہیں تم نے تو کوئی چکر نہیں چلا رکھا اس کے ساتھ؟''

''نہیں ایسی بات نہیں چاچا!'' پھر اس نے تیزی سے بات بدلی۔ ''چاچا بازار ابھی میاں نذر شکر الٰہی کی دکان بند نہیں ہوئی ہوگی۔ اس سے ... لے آؤ۔ لیکن بتانا کچھ نہیں۔''

چاچا گلریز گھبرایا ہوا باہر نکل گیا۔ اعجاز نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا۔ سنبل دھیرے دھیرے اپنے حواس میں آ رہی تھی۔ لالٹین کی روشنی میں اس کی پلکوں کی جنبش واضح محسوس کی جا سکتی تھی۔ اعجاز اس کی ہتھیلیوں کی مالش کرنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ اسے آہستگی سے پکار بھی رہا تھا۔ ''سنبل .. آنکھیں کھولو سنبل!''

پھر نجانے اس کے دل میں کیا آئی کہ اس نے اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔ وہ اسے پیار کرنے لگا۔ اسے اپنی باہوں کی گرمی پہنچانے لگا۔ وہ جاگ گئی۔ ادھ کھلی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ چند لمحے دیکھتی رہی۔ اعجاز کی سانسیں اس کے حسین چہرے سے چھو رہی تھیں۔ پھر اس کے نازک بازو حرکت میں آئے اور اعجاز کی گردن کے گرد حمائل ہو گئے۔ اعجاز کو محسوس ہوا کہ وہ اس کے سینے میں سماتی چلی جا رہی ہے !

○

ملک خداداد بہت عرصہ پہلے ہی بیٹی سے ہار چکا تھا۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ وہ کبھی اس کے ہاتھ پیلے نہیں کر سکے گا۔ وہ ایک بیمار روح کی طرح ہمیشہ اس کے گھر میں بھٹکتی رہے گی۔ لہٰذا جب اسے اپنی بیوی کی زبانی معلوم ہوا کہ سنبل شادی کے لئے مان گئی ہے تو وہ خوشی سے پھٹنے لگا۔ اس کی شادمانی کا یہ عالم تھا کہ اس شادمانی میں باقی ساری الجھنیں اور پریشانیاں دب کر رہ گئیں۔ بے شک اعجاز اس سے پہلے ایک بیوی کو چھوڑ چکا تھا۔ بے شک وہ ایک معمولی ملازم تھا، بے شک وہ ان کی برادری کا نہیں تھا۔ لیکن یہ سب کچھ ملک خداداد نے نظر انداز کر دیا۔ صرف ایک بات اس نے یاد رکھی، اس کی لاڈلی بیٹی اپنی جوانی بیتنے سے پہلے پہلے اپنے گھر کی ہو رہی تھی۔

پھر ایک روز اس قصبے کی گلیوں میں شہنائی کی گونج ابھری۔ یہ شہنائی سن کر چیڑ کے اداس درخت جھومے، دریا کا پانی بلیوں اچھلا، جھرنے گنگنائے اور ہر منظر نشے میں ڈوب گیا۔ اس رات جب اعجاز اپنے حجلہ عروسی میں داخل ہوا تو ٹھٹک گیا۔ پھولوں سے مہکتے ہوئے بستر پر نوب رو سنبل بے سدھ پڑی تھی۔ ایک لمحے کے لئے اعجاز کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ اسے لگا کہ سنبل پر پھر دورہ پڑ گیا ہے۔ تاہم اگلے ہی لمحے وہ خود کو سنبھال چکا تھا۔ یہ اس کے دل کی آواز تھی اور اس آواز پر اسے یقین کامل تھا کہ سنبل پر اب کبھی بیماری کا حملہ نہیں ہو گا اور نہ اس کی ذہنی رو بھٹکے گی۔ اس نے سنبل کی بیماری کی

...اور بڑی جرأت سے اُسے کاٹ ڈالا تھا۔

اس نے بڑے یقین کے ساتھ سنبل کو آواز دی۔

''سنبل''

''...مسائی ضرور لیکن اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ اعجاز نے اُس کے کان کے
...ب سرگوشی کی۔

''...نو !''

''ہوں !'' اُس نے آنکھیں بند کئے کئے کہا۔

''آج ایک اور خط آیا ہے تمہارے نام۔''

''کہاں ہے؟'' وہ مسکرائی لیکن اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔

''بہت پاس ہے۔''

پھر وہ واقعی اس کے بہت پاس چلا گیا۔ !

○○○